آزادی سے پہلے

مسلمانوں کا ذہنی رویہ

غلام کبریا

ترجمہ: حسن عابدی

مشعل

MashalBooks.org

آزادی سے پہلے

مسلمانوں کا ذہنی رویہ

غلام کبریا

ترجمہ: حسن عابدی

مشعل
آر۔ بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور54600' پاکستان

MashalBooks.org

آزادی سے پہلے مسلمانوں کا ذہنی رویہ

غلام کبریا

اردو ترجمہ: حسن عابدی

کاپی رائٹ اردو (c) 2002 مشعل بکس

کاپی رائٹ انگریزی (c) غلام کبریا

ناشر: مشعل بکس

آر-بی-5، سیکنڈ فلور،

عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور-54600، پاکستان

فون و فیکس: 042-35866859

Email: mashbks@brain.net.pk

http:/www.mashalbooks.org

MashalBooks.org

انتساب

میں اس کتاب کو بصد احترام ان پانچ ممتاز شخصیات کے اسمائے گرامی سے منسوب کرتا ہوں۔ یہ ہیں ڈاکٹر رفیق احمد خان، پروفیسر عبیداللہ درانی، پروفیسر کرار حسین، پروفیسر سید شمیم احمد اور ڈاکٹر اختر حمید خان جو میرے استاد اور گرو تھے اور جنہوں نے مجھے وہ سماجی شعور اور وہ اہلیت عطا کی کہ مسلمہ تصورات سے الگ ہو کر سوچ سکوں۔ کسی عصبیت کے بغیر اور اس حوصلہ مندی کے ساتھ کہ اپنی غلطیوں کا اقرار کرتے ہوئے انہیں درست کرتا رہوں۔

MashalBooks.org

MashalBooks.org

فہرست

1-	پیش لفظ	7
2-	تعارف	17
3-	آزادی سے پہلے کے ہندوستانی مسلمان	25
4-	آزادی نے ہندوستانی مسلمانوں کو آ لیا	81
5-	ہندوستانی مسلمانوں کا مغلی ورثہ	126
6-	ہندوستانی مسلمانوں کو کمپنی کی دین	155
7-	مسلمان قوم کی بدعہدی	176
9-	بدعہدی کے سلسلے کا آغاز	228
10-	اختتامیہ	291

MashalBooks.org

MashalBooks.org

پیش لفظ

1930ء کی دہائی میں، میں سکول کا طالب علم تھا اور متوسط طبقے کے ہر تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمان کی طرح میں بھی یہی جانتا تھا کہ مسلمانوں کے تمام مسائل کا سبب ہندو اور انگریز ہیں۔ دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی یہی معلوم تھا کہ انگریزوں نے ہندوؤں کی چشم پوشی اور چند مسلمانوں کی غداری کی بدولت مسلمانوں کو ہندوستان کی سلطنت سے محروم کر دیا تھا۔ یہ باتیں کسی نے ہمیں بتائی نہیں تھی۔ بس ہمیں ان کا علم ہو گیا تھا۔ بچپن کے ابتدائی دنوں سے ہی مجھے ہر روز اور خاص طور پر جمعہ کے دن نماز پڑھنے کے لیے مسجد لے جایا جاتا تھا اور بسا اوقات میں وعظ بھی سنتا تھا۔ خواہ ہمارے مولوی صاحب وعظ کرتے ہوں یا کوئی عالم جو ہماری طرف آ نکلتے تھے ہمیں یہی بتایا جاتا تھا کہ سارے مسلمان جنت میں جائیں گے اور تمام بے دینوں کو جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ ہمیں یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ اگر ہم ناداروں اور محتاجوں کو خیرات دیں گے تو اللہ تعالیٰ ہمیں اس کا ثواب دے گا۔ ہمیں یاد نہیں آتا کہ کبھی کسی عالم نے ہمیں ہماری سماجی ذمہ داریوں کے بارے میں بھی بتایا ہو۔ میں جوں جوں بڑا ہوتا گیا یہ دیکھتا رہا کہ ہمارے خاندان میں مختلف مواقع پر مثلاً محرم اور شب برات پر فاتحہ خوانی ہوتی کیونکہ ہمارا خاندان متوسط طبقے کا ایک دیندار خاندان مشہور تھا۔ اس موقع پر خاص کھانے پکائے جاتے جن میں شرکت کے لئے رشتہ داروں کو مدعو کیا جاتا اور فاتحہ کے بعد دعوت ہوتی۔ کچھ تھوڑا سا کھانا ہمسائے میں غریب لوگوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ اس کار خیر کی وجہ سے ہمارا خاندان ایک خدا ترس، عزت دار خاندان سمجھا جاتا تھا۔ درمیانہ طبقے اور دولت مند مسلمان خاندان کے لوگ بھی یہی کچھ کرتے، جو ہمارے خاندان یا ایسے ہی دوسرے گھرانوں کے لوگ کرتے تھے۔

MashalBooks.org

خوشحال ہندو خاندانوں کی مذہبی سرگرمیاں اور طرح کی ہوتی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ روزانہ نماز، روزے اور فاتحہ خوانی کا بدل ہندوؤں کے یہاں کیا تھا اور میں نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی، تاہم میں نے پانی کے پیاؤ دیکھے تھے، جہاں ٹھنڈے پانی سے پیاسے اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ پھر ان کے دھرم شالے ہوتے جہاں ہندو یاتری آ کر رات گزارتے۔ یہ اقامت مفت یا معمولی اجرت کے عوض ہوتی تھی۔ ہندوؤں کی کچھ اور سرگرمیاں رفاہ عامہ کے سلسلے میں ہوتی تھیں۔ یہ مستقل نوعیت کی ہوتیں جنہیں آسودہ حال ہندو خاندان مل جل کر چلاتے یا دولت مند انفرادی طور پر جاری رکھتے تھے۔ میں نے نہ کبھی دیکھا اور نہ یہ سنا کہ مالدار مسلمانوں نے نجی طور پر یا مل جل کر اپنی برادری کے لئے ان کے برابر کے ادارے قائم کئے ہوں۔ میں نے یہ بھی کبھی نہیں سنا کہ متمول مسلمانوں نے انفرادی یا اجتماعی طور پر اپنی برادری والوں کے لئے سکول اور کالج قائم کئے ہوں۔ نادار مسلمان مسافروں کے لئے سرائیں بنانا تو دور کی بات ہے۔ البتہ دولت مند ہندوؤں نے انفرادی طور پر یا مل جل کر ہسپتال سکول اور کالج کھولے اور انہیں جاری رکھا۔ میں نے جس شہر میں پرورش اور تعلیم پائی اور جہاں میرے والد وکالت کرتے تھے، وہاں ایک مسلم سکول تھا۔ اس مسلم سکول کی تعلیمی کارگزاری تو نہایت قابل تعریف تھی لیکن فنڈ نہ ہونے کی وجہ سے اپنی بقا کی جدوجہد میں ہمیشہ مصروف رہتا لیکن اس ضلع میں پانچ بڑی پرشکوہ جاگیرداریاں تھیں۔ ان میں سے چار مسلمان نوابوں اور راجاؤں کی تھیں۔ ہندو سکول ایک ہی تھا۔ دیانند اینگلو ر نا کیولر باڈی اے وی سکول کی مالی حالت اچھی تھی چنانچہ جلد ہی کالج بن گیا لیکن مسلم سکول چار بڑی مسلم جاگیرداریوں کے ہوتے بھی کالج نہ بن سکا۔ اس ضلع میں ہندوؤں کی واحد ریاست بہت چھوٹی تھی، مسلمانوں کی سب سے چھوٹی ریاست بھی چھوٹی۔

مجھے یقین ہے کہ شہر میں ہمارے خاندان کی طرح دوسرے خاندانوں کے لڑکے بھی یہ نہیں جانتے تھے اور نہ جاننا چاہتے تھے کہ مسلمان خاندان کس طرح گزر بسر کرتے ہیں۔ میں بھی اس بات سے لاعلم رہتا۔ اگر ایک سبب نہ ہوتا وہ یہ کہ میری ماں اور میرے دادا ہمارے علاقے کے ناداروں کی ہمیشہ مدد کرتے رہتے تھے۔ اس میں دوائیوں کی خریداری یا دوسری ہنگامی ضرورت کے لئے اور کپڑے بنانے کے لئے مالی اعانت شامل

MashalBooks.org

ہوتی تھی۔ اس سے فیض یاب ہونے والوں میں ہندو بھی شامل ہوتے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ بہت سے مسلمان اس پر معترض ہوتے کیونکہ ''کافروں کو مدد دینے میں کوئی ثواب نہیں تھا۔'' لیکن میری والدہ اس پر اصرار کرتیں کہ انسان آخر انسان ہیں، چاہے کافر ہوں۔ میری والدہ اور میرے دادا دونوں کو اس بات پر اصرار تھا کہ نادار اور محتاج لوگوں کی مدد کرنا ایک سماجی ذمہ داری ہے۔ وہ اس بات پر بھی بہت زور دیتے تھے کہ اپنی ذات کی تشہیر کے لئے نیک کاموں کا چرچا نہیں کرنا چاہئے۔ میرے والد اور دوسرے قریبی رشتہ دار ان ساری باتوں کو محض حماقت سمجھتے تھے۔ مجھے اپنی سماجی ذمہ داریوں کا علم اپنی والدہ اور دادا جان کے ذریعے سے ہوا۔ باقی لوگ اور ان میں میرے والد بھی شامل تھے صرف ثواب اور گناہ کی باتیں کرتے رہتے۔ انہوں نے عام لوگوں کے مصائب و آلام کا تذکرہ انسانی احساسات کے حوالے سے کبھی نہیں کیا۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ گھر میں ایسی کوئی کتابیں تھیں یا میرا خیال ہے نہیں تھیں جو ہمیں سماجی ذمہ داریوں کے بارے میں اور دوسروں کی تکالیف اور ان پر انسانی احساس کے تعلق سے کچھ بتاتیں۔

میرے بہت سے ہندو دوست تھے۔ جیسے میرے والد کے دوست، ان کے پیشے اور مجلسی زندگی کے تعلق سے تھے۔ میرے والد ایک کٹر مسلم لیگی تھے لیکن ان کا ایک عزیز ترین دوست ہندو تھا اور وہ بھی وکیل تھا لیکن کٹر کانگریسی مسلم لیگی تھے لیکن ان کا ایک عزیز ترین دوست ہندو تھا اور وہ بھی وکیل تھا لیکن کٹر کانگریسی۔ بہت سے ہندو اور مسلمان تہواروں کے موقعوں پر ایک دوسرے سے ملتے رہتے۔ ہندو، عید اور شب برات، اور مسلمان ہولی اور دیوالی پر۔ مذہبی اختلافات کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس کے مراسم خوشگوار تھے اور یہ بات شہروں سے زیادہ گاؤں میں تھی۔ ایک ہی زبان بولتے تھے جسے ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ ہندوستانی جب فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تو اسے اردو کہا جاتا تھا اور جب دیوناگری خط میں لکھی جاتی تو ہندی کہلاتی۔ سکولوں میں جن طلبہ کی پہلی زبان اردو ہوتی ان کے لئے ثانوی زبان کے طور پر ہندی پڑھنا ضروری تھا اور جن کی پہلی زبان ہندی ہوتی ان کیلئے ثانوی زبان کے طور پر اردو کی تدریس لازمی ہوتی۔ بہت سے ہندو سکولوں میں اردو پہلی زبان کے طور پر پڑھائی جاتی لیکن مجھے تو ایک بھی ایسا مسلم سکول یاد نہیں آتا جہاں کی پہلی زبان ہندی ہو۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان میل جول میں

تپاک، صارف میرے خاندان، میرے شہر اور صوبے تک محدود نہ تھا۔ اس کا اندازہ تو مجھے اس وقت ہوا جب میں علی گڑھ پہنچا۔ علی گڑھ میں سارے ہندوستان سے طلبہ پڑھنے کے لئے آتے چنانچہ ہم آپس میں بہت سے معاملات پر تبادلہ خیال کرتے اور ان میں ہندو مسلم تعلقات کا معاملہ بھی شامل تھا۔ کبھی کبھار لیک صرف چند جگہوں پر اور انہی میں کان پور بھی تھا۔ مسلسل فسادات ہوتے رہتے۔ اس کے باوجود کہ نجی اور اجتماعی سطح پر بھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات قائم تھے تعلیم یافتہ اور متوسط طبقے کے مسلمان عام طور پر خود کو برتر درجہ دیتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ماضی میں دہلی کے تخت پر مسلمان حکومت کرتے آئے تھے۔ اسی طرح متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ ہندو مسلمانوں کو مداخلت کار قرار دیتے تھے جنھوں نے ان پر محکومی مسلط کی تھی۔

ہندوستان میں زبردست سماجی ناہمواری اور مختلف ذاتوں کے درمیان امتیاز خوفناک حد تک موجود تھا لیکن اس سلسلے میں ایک عام بے حسی پائی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں بھی اونچے اور نچلے طبقے موجود تھے حالانکہ اسلام میں ایسے امتیاز کو سختی سے ناپسند کیا گیا ہے کہ کسی فرد کا کسی بھی خاندان میں پیدا ہونا محض ایک اتفاقی امر ہے لیکن ہندوؤں میں یہ تفریق، غیر انسانی طور پر ہولناک تھی۔

مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی کسی موقع پر اس امر پر تشویش ظاہر کی گئی ہو کہ اس غیر اسلامی سماجی طرز عمل کو آخر کیوں برداشت کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ بات کہ ایک مسلمان کو محض اس کی پیدائش کے حوالے سے حقیر کیوں سمجھا جاتا ہے۔ سماج کے اس طرح حصے بخرے ہونے پر خود ہندوؤں میں بھی کوئی تشویش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس سے بھی بدتر بات، محض ذات برادری کے نظام کے تحت بدترین درجے کی تفریق اور نابرابری تھی حالانکہ ہندوؤں میں گاندھی جی کے لیے بڑا احترام پایا جاتا تھا۔ ماضی کو دھیان میں لاتا ہوں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ گاندھی نے ذات برادری کے نظام کو جڑ سے ختم کرنے کے لئے عوامی تحریک کیوں نہیں چلائی۔ حالانکہ یہ نظام انسانی وقار کے منافی اور انتہائی توہین آمیز تھا۔ اچھوتوں کو ہریجن یعنی بھگوان کے بچے کہہ کر گاندھی کے اپنے ضمیر کی تسکین تو ہو جاتی تھی حالانکہ اچھوتوں کے ''اچھوت پن'' میں کوئی کمی نہ آتی اور انکے حالات ذرا بھی بہتر نہ ہوتے۔ خود مسلمانوں کے درمیان جو اپنے آپ کو بڑے فخر سے پیغمبر اسلامؐ کی امت قرار

دیتے تھے کوئی ایسا رہنما پیدا نہیں ہوا جو ایک غیر اسلامی غیر انسانی اور ذات برادری کے نظام کو ختم کر کے معاشرے کو اسلامی بنانے کے لئے کسی عوامی تحریک کی قیادت کرنا۔

وقت گزرتا رہا، میں بڑا ہوتا گیا لیکن مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے کبھی اپنے بڑوں کو مسلمانوں کے سماجی، اقتصادی اور اخلاقی مسائل پر گفتگو کرتے سنا ہو۔ اگر کبھی کچھ سنا تو یہی کہ امام مہدی علیہ السلام مسلمانوں کے نجات دہندہ بن کر ظہور فرمائیں گے اور پھر ساری دنیا پر مسلمانوں کی حکمرانی ہوگی۔ حقیقی زندگی میں اس کی کیا ضرورت ہوگی؟ اس پر کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ مسلم معاشرے کے روحانی، سماجی، اخلاقی اور معاشی حالات کو بہتر بنانے کے لئے کسی مسلمان پر کون سی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس پر بھی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس معاملے میں فرد کا کوئی کردار ہوسکتا ہے۔ سب کیلئے ایک ہی جواب تھا، یعنی اللہ کی مرضی۔ جب میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے 1940ء کی دہائی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوا تو اس وقت اندازہ ہوا کہ بیشتر مسلمان گھرانوں کا طرز عمل بالکل ہماری ہی طرح کا تھا۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں ہمارے بیشتر پروفیسر ہندوستان گیر بلکہ عالمی شہرت کے مالک تھے لیکن میں نے ایسی کوئی کتاب نہیں پڑھی، جو بڑی کلاس کیلئے نہ سہی کم از کم نچلے درجے کے طلبہ کیلئے ہی مسلمان اساتذہ نے لکھی ہو۔ لے دے کے ایک ہی الجبرے کی کتاب تھی جو میں نے انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں میں پڑھی۔ درحقیقت وہ ساری درسی کتابیں جو ہم نے پڑھیں یا تو انگریز مصنفوں کی ہوتیں یا ہندوؤں کی ہوتیں۔ البتہ اردو اور دینیات کی کتابیں اس سے مستثنیٰ تھیں۔ مجھے یہ بھی علم ہوا کہ سائنس کے مضامین میں ہمارے بعض پروفیسر صاحبان زبردست سائنسدان شمار ہوتے تھے۔ البتہ ان کی ایجادات یا ریسرچ کیا تھی؟ ان کی نشاندہی کرنے میں میں معذور تھا۔ ایم اے اردو کی جماعتوں میں میرے سینئر طلبہ ڈاکٹر رائے بہادر رام بابو سکسینہ کی تاریخ اردو ادب اور ساتھ ہی اردو ادب میں ہند یورپی اساتذہ کی جیسی تصانیف پڑھتے تھے۔ اس کے باوجود اپنے پروفیسروں کے بارے میں ہمارا وہ زعم کم نہیں ہوتا تھا اور یہ بھی دیکھئے کہ غالب کے کلام کا شارح مالک رام سے بہتر کوئی نہ تھا جو ایک ہندو تھے۔ لیکن اس بات کی بھی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ان سب باتوں کے علاوہ کسی نے بھی لکھنؤ کے منشی نول کشور کو کوئی اہمیت نہیں دی جن کے اشاعتی ادارے

MashalBooks.org

اور چھاپے خانے نے اردو کے کلاسیکی ادب، قرآن کریم اور دیگر اسلامی کتب کی اشاعت کا سلسلہ وسیع پیمانے پر پھیلا رکھا تھا جو کسی بھی مسلمان ادارے حتیٰ کہ لاہور کے مولوی فیروز الدین کی مساعی سے بھی آگے تھا۔

علی گڑھ میں ہر طرح کی سرگرمیاں خاص طور پر سیاسی سرگرمیاں، ان دنوں زوروں پر تھیں۔ علی گڑھ بڑی حد تک مسلم لیگ کا گڑھ تھا اس کے باوصف طلبہ کے ایک مختصر سے گروہ اور ان سے زیادہ اساتذہ میں پاکستان کے متعلق میں یہ شک موجود تھا کہ کیا یہ مسلمانوں کے مسائل کا حل ہوگا؟ علی گڑھ میں میرے داخلے سے چند سال پہلے تک یہاں کمیونسٹوں کا غلبہ تھا۔ جب 1937ء میں مسلم لیگ کی تنظیم نو مسٹر جناح کی قیادت میں ہوئی تو کمیونزم سے مسلم لیگ کی طرف تبدیلی کا ریلا چل پڑا۔ ان دنوں علی گڑھ میں کوئی کانگریسی یا قوم پرست مسلمان اگر موجود رہا ہو تو کم از کم مجھے نظر نہیں آیا تاہم اختلاف رائے کو برداشت کیا جاتا تھا جو لوگ پاکستان کے تصور سے اختلاف کرتے انہیں کریک (خبطی Crack) کہا جاتا تھا۔ علی گڑھ میں سنکی یا احمق کے لئے کریک یک اصطلاح وضع کی گئی تھی لیکن انہیں غدار نہیں کہا جاتا تھا اگرچہ 90 فیصد طلبہ لیگی تھے لیکن 50 فیصد اساتذہ ان سے مختلف رائے رکھتے تھے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اگرچہ یوپی میں واقع تھی لیکن یہ ادارہ سارے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے تھا۔ مسلمان طلبہ یہاں ہندوستان کے ہر گوشے سے، جنوب میں مدراس سے مشرق میں آسام سے، شمال میں کشمیر سے اور مغرب میں سرحد اور بلوچستان سے داخلہ کیلئے آتے تھے۔ ان میں شامل پٹھان، بلوچ، سندھی، پنجابی اور بنگالی تھے جن کا تعلق مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں سے تھا جو مختلف بولیاں بولتے تھے اور قدرے مختلف کلچر کے مالک تھے۔ مسلمانوں کے اقلیتی آبادی کے صوبوں سے طلبہ آتے تھے۔ یہ مدارسی تھے، میسوری اور گجراتی تھے اور اڑیسہ کے طلبہ تھے جن کی زبانیں ایک دوسرے سے بہت مختلف تھیں۔ اور آخر میں اردو بولنے والے علاقوں سے آئے ہوئے طلبہ تھے یعنی حیدرآباد، ممبئی، سی پی، بھوپال اور راجپوتانہ کی ریاستیں اور یوپی اور بہار کے طلبہ لیکن ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں تھی۔ وہ سب علی گیرین تھے اور انہیں اس پر فخر تھا۔

اسی طرح سارے ہندوستان سے آنے والے اساتذہ تھے، جن میں ہندو بھی

MashalBooks.org

شامل تھے اور ان کی الگ الگ مادری زبانیں تھیں۔ مجھے کچھ یاد ہے کہ ہندو یا مسلمان کوئی بھی استاد جس کا تعلق کسی ایک صوبے یا علاقہ سے رہا ہو۔محض اپنے علاقے کے طلبہ میں مقبول نہیں ہوتا تھا۔ زندگی کے کسی شعبہ میں تفریق ہرگز نہیں تھی۔ وہ شعبہ مذہب کا ہو، سماجی یا کھیلوں کا ہو یا تعلیم و دانش کا شعبہ ہو۔ میں نے ان پروفیسر صاحبان کو بھی جو مسلم لیگ کے کاز سے وابستہ تھے،کبھی مسلمانوں کی کمزوریوں پر بحث کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یعنی مسلمانوں کی ناخواندگی، ان کا افلاس ان میں حوصلہ مندی کا فقدان، ان میں ذات پات کا تفرقہ اور ان کا غیر اسلامی سماجی نظام یا جاگیرداری نظام، جو پاکستان بننے کے بعد مغربی پاکستان یا دوسرے علاقوں میں موجود ہو گا۔ میں نے یہ بھی کبھی نہیں سنا کہ پاکستان میں حکومت کیسی ہو گی۔ اس کا معاشی نظام کیا ہو گا اور اس نوع کے دوسرے مسائل۔ ان معاملات پر کتابیں بھی نہیں لکھی گئی تھیں۔ درحقیقت ایک بھی ایسی کتاب دستیاب نہ تھی۔ اگرچہ ان کی اکثریت سنجیدہ قسم کے اخلاقی، سماجی اقتصادی اور سیاسی مسائل پر بحث و مباحثہ نہیں کرتی تھی لیکن گنتی کے چند لوگوں کا ایک مختصر سا گروہ ضرور موجود تھا جو ان مباحث میں حصہ لیتا تھا اور ان میں کمیونسٹ بھی شامل تھے۔ غیر کمیونسٹ ارکان کے ایک ایسے ہی گروہ میں مجھے شمولیت کا موقع ملا۔ ان کی سربراہی دو مسلمان نوجوان کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے انڈین سول سروس کے ایک افسر کی حیثیت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ دوسرا نوجوان میرٹھ کے ایک کالج میں انگریزی کا استاد تھا۔ یہ گروہ نہایت اہم نوعیت کے مسائل پر غور و بحث کرتا تھا۔ وہ ایک ہفت روزہ بھی شائع کرتے تھے۔ اس کے اوراق میں آزادی کے بعد مسلمانوں کو درپیش ہونے والے مسائل پر بحث شامل ہوتی تھی۔

طلبہ اور اساتذہ کے درمیان مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے موضوع پر اکثر بحث ہوتی رہتی۔ مسلمان سلطنتوں کے بارے میں ان سب کا ایک نوسٹلجیا تھا۔ وہ سلطنتیں بحر اوقیانوس سے بحر الکاہل تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی طرح فلسفے، سائنس اور علمی موضوعات پر مسلمانوں کے کارناموں کے حوالے سے اکثر گفتگو ہوتی لیکن محض رواداری کے انداز میں زیادہ سنجیدہ اور گہرائی کے ساتھ نہیں۔ ہر شخص کو اس بات پر بڑا فخر تھا کہ ان علوم اور خاص طور پر سائنس کے باب میں مغرب والے، مسلمانوں کے مرہون احساس ہیں۔ اس کے ثبوت میں علامہ اقبال کی نظمیں پڑھی جاتی تھیں اور مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی مسلمانوں کے

MashalBooks.org

تدبر، ان کے تمدن اور دیگر نسلی، لسانی، مذہبی، سماجی اور تہذیبی پس منظر سے وابستہ لوگوں سے رواداری کا سلوک اور ان سب سے سوا، ان کے سماجی انصاف اور قانون کے تحت عدل اور انصاف کے معاملات پر بھی بحث کی جاتی ہو۔ مسلمانوں کے زریں زمانے اور آج ان کے دور زوال اور انحطاط کے درمیان تقریباً پانچ سو برس کا فاصلہ حائل ہے۔ اس پر کبھی بحث نہیں ہوئی اور نہ اس کا اظہار ان کی شاعری میں ہوا۔ اس طرح کبھی سوچا نہیں گیا تھا۔ اس گزرے ہوئے طویل زمانے کا ان کے ذہن میں کوئی تصور ہی نہیں تھا اور وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر تھے کہ مسلمانوں کی سائنس ابھی اس بیج کی طرح تھی جس سے اکھوے پھوٹ رہے ہوں جبکہ مغرب میں سائنس تیزی سے بلند ہوتے ہوئے ایک شاداب اور ہرے بھرے عظیم الجثہ درخت کی طرح تھی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا جب کسی موقع پر مسلمانوں کے زوال اور پانچ سو برس پر محیط ان کی پسماندگی پر بھی بحث ہوتی ہو گی۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں آتا کہ علم کی عظمت، رواداری، مہم جوئی اور تہذیب کو فروغ دینے والی خصوصیات کو بھی کوئی اہمیت دی گئی ہو۔

1945ء میں آزادی کے امکانات روشن ہو گئے تھے۔ دراصل اس مرحلے پر ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف ہندو اور انگریز کے گٹھ جوڑ کا انکشاف علی گڑھ کے اساتذہ اور طلبہ پر ہوا جس طرح دوسرے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس کا علم ہو گیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان کا وجود ایک زندہ حقیقت کے طور پر ابھرنے لگا تھا۔ بہت سے اساتذہ اور طلبہ کو یقین تھا کہ علی گڑھ اور آگرہ دونوں پاکستان میں شامل ہوں گے اور دہلی تو بہرطور ہو گی ہی۔ یہ بات بھی معلوم تھی کہ پاکستان کا آغاز تو ایک نادار ملک کے طور پر ہو گا لیکن جلد ہی بلوچستان میں سونے، چاندی، تانبے اور لوہے کی کانیں نکل آئیں گی جن سے پاکستان ایک دولت مند ملک بن جائے گا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ لاہور میں ڈیزل انجن، بجلی کے پنکھے کی صورت میں برقی موٹریں اور مشینی کل پرزے بنائے جا رہے تھے۔ لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے ہم جماعت طلبہ میں سے کوئی اکنامکس پڑھ رہا تھا یا اس مضمون کی تدریس کو پاکستان کی بنیاد کیلئے اہم سمجھتا ہو کہ یہ علم تعمیراتی منصوبوں کے قیام اور مشینوں کی تنصیب کیلئے نہایت مضبوط بنیاد فراہم کرتا تھا۔ ہماری گفتگو میں سندھ اور پنجاب کی زرخیز زراعت کا بھی کوئی تذکرہ نہیں ہوتا تھا۔

MashalBooks.org